ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.3 (2024)
(July to September)

"ایسی بلندی ایسی پستی" میں اینٹی ہیرو کا کردار

The role of the anti-hero in"Aisi Bulandi Aisi Pasti"

علی مرتضیٰ
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر رابعہ سرفراز
صدرِ شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Ali Murtaza
Ph.D Research Scholar Department of Urdu, GC University, Faisalabad
Dr. Rabia Sarfaraz (Corresponding Author)
Chairperson, Department of Urdu, GC University, Faisalabad

Abstract:
The term antihero was coined as early as 1814. The term primarily featured in existentialist works in the early twentieth century. Antihero is a seemingly contradictory term that can be found throughout literature, film, and television. We encounter such protagonists throughout literature. which has ineffective flaws and seemingly no quality that can be called its one-of-a-kind and universal qualities. An anti-hero is a main character who lacks hero-like qualities. In this novel, the author has fully depicted the members of the royal family of Hyderabad, Nawabs, nobles, chiefs and their westernized people and their luxury. Sultan Hussain is the western character of this novel who is educated in America. He goes to Missouri every year to fulfill his indulgence. Sultan Hussain considers women as mere means of pleasure. There is no ability to accept women with responsibilities. Rather, he uses women only for his own benefit and satisfaction. Thus the main character represents a fallen social evil that proves to be an anti-hero. Thus, Sultan Hussain's Karda is unable to be a hero despite the central characters because he does not have hero-like qualities anywhere, rather he lacks hero-like qualities which proves to be an anti-hero.

Keywords: existentialist, film and television, Hyderabad, Nawabs, nobles, responsibilities, Sultan Hussain's Karda.

میں استعمال کی گئی۔جو کہ بنیادی طور پر اٹھارویں صدی میں رامیو کے بھتیجے جیسے کاموں میں ابھری تھی۔یہ انگریزی شاعر لارڈ بائرن کی تخلیق کردہ بائرونک ہیروز کا احاطہ کرنے کے لیے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر استعمال ہوتی ہے۔انیسویں صدی میں ادبی رومانویت نے اینٹی ہیروز کی نئی شکلوں کو مقبول بنانے میں مدد کی۔اینٹی ہیرو بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں وجودیت پسندانہ کاموں

میں نمایاں ہوا۔ جیسے فرانز کافکا کی دی میٹا مورفوسس، ژاں پال سارتر کی متلی اور البرٹ کاموس کی دی سٹرینجر وغیرہ۔ ان کاموں میں مرکزی کردار ایک غیر فیصلہ کن مرکزی کردار ہے جو اپنی زندگی میں بوریت، غصہ اور بیگانگی سے نشان زد ہے۔

اینٹی ہیرو ۱۹۵۰ کی دہائی میں اور ۱۹۶۰ کی دہائی کے وسط تک ایک اجنبی شخصیت کے طور پر امریکی ادب میں داخل ہوا۔ جو بات چیت کرنے سے قاصر تھا۔ ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۹ کی دہائی کا امریکی اینٹی ہیرو عام طور پر اپنے فرانسیسی ہم منصب سے زیادہ فعال تھا۔

اینٹی ہیرو ایک اصطلاح ہے جو بذات خود متضاد معلوم ہوتی ہے۔ جو کہ پورے ادب، فلم اور ٹیلی ویژن میں پائی جا سکتی ہے۔ نوٹس فرام انڈر گراؤنڈ میں (۱۸۶۴) میں، دوستوفیسکی واضع طور پر اس لفظ کو تضاد کے تصور سے جوڑتا ہے۔ جب وہ ناول کے اندر ہیرو کے خیال کو ختم کر دیتا ہے۔ پورے ادب میں ہمیں ایسے مرکزی کرداروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو غیر موثر، خامیاں اور بظاہر کوئی ایسی خوبی نہیں رکھتے جو اس سے متعلق ہوں۔

در حقیقت اگر ہیرو کی روایت کو دیکھیں تو وہ جدید اور عصری فکشن کے اینٹی ہیرو کا کردار ادا کرتا ہے۔ جس میں اچیلز، اوڈیپس اور اینٹیگون وغیرہ سبھی اپنے ذاتی ضابطوں کے احترام میں انتہائی تشدد کے قابل ہے۔ اینٹی ہیرو نے جو کچھ دیکھا وہ ہماری توقعات میں خلل ڈال کر اور اس کے علاوہ ہمیں اس میں ملوث ہونے پر آمادہ کر کے بہادری کے تصورات پر تنقید کرتا ہے۔ ہم اینٹی ہیروز کو نفی کے طور پر غور کر سکتے ہیں، جس میں وہ ایماندار، مثالی، بہادر، قابل احترام اور عظیم نہیں ہے۔ اس کے باوجود پر بھی وہ اپیلیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی حوالے سے کلیم الدین احمد رقمطراز ہیں:

> "اینٹی ہیرو، ہیرو کا دوسرا چہرہ۔ وہ شعوری طور پر ارادتاً اچھی خصوصیات سے مبرا ہوتا ہے۔"(۱)

بعض دفعہ ایسا لگتا ہے کہ اینٹی ہیرو کا کردار ان طریقوں کو چیلن کرنا ہے جس میں ہم خود کو دیکھتے ہیں یا پھر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس ہیروز کو ان کی عزت اور فخر سے وابستگی کی وجہ سے مانا جاتا ہے۔ جب کہ اینٹی ہیروز ممکنہ طور پر ان کا اپنا ضابطہ اخلاق ہونا، کسی تعظیم کی ضرورت نہیں ہے۔ در حقیقت یہ کردار معاشرے کی توقعات کے سامنے جھکنے سے انکار نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے خلاف بغاوت کرتے ہیں جو ہم سب کو باندھتے ہیں۔ شاید یہ بتاتے ہیں کہ اینٹی ہیرو پر مشتمل ادب رجعتی دور میں کیوں کھلتا نظر آتا ہے۔

اینٹی ہیروز میں موجود دہری اور منقسم بہادری، ایک ایسا شخص جس کا اخلاقی کمپاس کبھی مضبوطی سے شمال کی طرف اشارہ نہیں کرتا، جرائم کے افسانوں میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ المناک ہیرو کی طرح، ٹام ریپلے، لوفورڈ، ٹونی سوپرانو اور والٹر وائٹ جیسے اینٹی ہیروز اپنی فطرت کے تاریک پہلو کو سامنے آنے دیتے ہیں۔ ہمیں عام طور پر ایسے کرداروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو معاشرے کے ساتھ نہ ختم ہونے والی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انہیں عام طور پر کچل دیا جاتا ہے یا پھر شکست دے کر انہیں صفحہ ہستی سے بالکل خاموش کر دیا جاتا ہے۔ اینٹی ہیرو بنیادی طور پر ایسا کردار ہوتا ہے جس میں طاقت، ہمت، بہادری، اخلاقیات، دیانتداری اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خاطر جنگ لڑنے کی قابلیت نہیں ہوتی بلکہ وہ اعلیٰ مقاصد کی رہنمائی اور انسانیت کی بھلائی کرنے سے بھی قاصر رہتا ہے۔ اسی حوالے سے ہیری شانے اینٹی ہیرو کی تعریف یوں کی ہے:

A character who lacks the qualities needed for heroism'an antihero does not posses " nobilty of life or mind and does not have an attitude marked by high purpose and lofty aim.king claudius in Hamlet is an antihero."(2)

اینٹی ہیرو کسی بھی فکشن میں ایسا کردار ہوتا ہے جس میں روایتی خصوصیات کی کمی ہو۔اس میں وہ کوالٹی ہو سکتی ہے جس کو سماج میں منفی تصور کیا جائے۔ان کمی کوتاہیوں کے باوجود یہ ہیرو کا کام کرتا ہے۔اس کے ایکشن کے نتائج مثبت ہوتے ہیں لیکن ان کے طریقہ کار غلط اور نتائج سے دور ہو سکتے ہیں۔دراصل اینٹی ہیرو میں ہیرو جیسی خصوصیات نہیں ہوتی اس کا موازنہ عام طور ٹریجک ہیرو سے کیا جا سکتا ہے۔ایسا ہیرو جس کی خصوصیات اچھی ہوں مگر وہ کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے۔اس میں ایک بڑی خامی یہ بھی ہوتی ہے کہ جو غلطی وہ سرزد کرتا ہے اسے وہ غلطی خود بھی معلوم نہیں ہوتی اور وہی غلطی اسے زوال، تباہی اور موت کی طرف لے جاتی ہے۔اس سے ظاہر ہوا کہ اینٹی ہیرو ایک کمزور، اناڑی، غیر ہنر مند، بدقسمت، بے وقوف اور نتائج سے بے خبر کردار ہوتا ہے۔عتیق اللہ اس کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> "ہیرو (مرکزی کردار) کی مقبول عام روایتی خصوصیات سے عاری کردار جو قابل رحم، کمزور، تمسخر آمیز، خود کوش، تنہا یا سماج دشمن ہو۔وہ اپنے آپ کو بے بس اور دنیا کو اپنی دسترس سے باہر خیال کرتا ہے۔"(۳)

اینٹی ہیرو ہمیشہ ناخوش نظر آتا ہے۔کیوں کہ وہ اپنی زندگی سے مطمئن کہیں بھی نظر نہیں آتا۔یہ انتہائی خود غرض، لالچی اور عام لوگوں کے خلاف باغی دکھائی دیتا ہے۔اینٹی دلچسپ، پیار کرنے والا اور قابل رحم کردار ہوتا ہے جس سے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمارے اندر ہمدردی کے جذبات ابھرتے نظر آتے ہیں۔وہ بنیادی طور پر ہم جیسے قارئین سے اپیل کرتے ہیں کیونکہ ہم انسانی سطح پر ان سے بہت زیادہ جڑ سکتے ہیں۔ایک عام انسان کی طرح اینٹی ہیرو بھی اس سوچ سے بالاتر اور بے نیاز ہوتا ہے کہ لوگ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے۔سلیم اختر اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "حقیقت نگاری پر مبنی انداز نظر کی وجہ سے ہیرو پہلے عام اور حقیقی افراد کی سطح پر آیا اور اس کے بعد اینٹی ہیرو کی صورت میں ہیرو کا نیا روپ سامنے آیا۔اینٹی ہیرو کا تصور جدید دور کی پیداوار ہے اور اسے اینٹی ناول سے مشروط قرار دیا جا سکتا ہے۔"(۴)

مختلف محققین کی رائے اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ بنیادی طور پر اینٹی ہیرو کا تعلق ایک حقیقی انسان سے جوڑا گیا ہے۔اس طرح یہ حقیقت ہے کہ ایک معاشرتی انسان میں کبھی بھی ہیرو تو ہو نہیں سکتا بلکہ ایک عام انسان ہونے کے ناطے اس میں ہر طرح کی کمی کوتاہیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں۔اس لیے بعض ادیب فکشن میں ایک نئے قسم کے کردار کو سامنے لائے جس میں ہر طرح کی منفیت اکٹھی ہو چکی تھی۔اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہی گرے پڑے بگڑے کردار موجودہ دور کی بے یقینی، بے دلی اور بے حسی کی بھرپور اور کامیاب نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔عصر حاضر میں اینٹی ہیرو کی حیثیت ثانوی نہیں بلکہ مرکزی ہو چکی ہے۔اس کا مدمقابل بھی کوئی نہیں ہوتا۔وہ نہ صرف قابل تعریف خوبیوں سے محروم دکھایا جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور اس سے دو چار ہونے والے کردار بھی اسے بہتری کی طرف بڑھنے کا کوئی موقع فراہم نہیں کرتے۔غرض ہر طرح سے وہ ایک بے

بس، کمزور، بزدل، بدقسمت اور خوف کی اندھی گہری کھائیوں میں جکڑا ہوا کردار ثابت ہوتا ہے۔ ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' ۱۹۴۷ میں چھپ کر منظر عام پر آیا یہ ناول عزیز احمد کے اہم ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس ناول میں عزیز احمد نے اپنے ہی وطن حیدرآباد کی تہذیب و معاشرت کو اپنے عہد کے آئینہ سے پیش کیا۔ ناول میں مصنف نے حیدرآباد کے شاہی خاندان کے افراد، نوابوں، امراء، رؤسا اور ان کی نوجوان اولاد کی مغرب زدہ زندگی اور ان کی عیش پرستی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس میں دولت کی فراوانی اور اس کا بے جا استعمال، آئے دن ہونے والی پارٹی نما محفلوں۔ مسوری کی سیر و سیاحت، شراب نوشی۔ تاش اور جوئے بازی سینما بینی اور عورت بازی وغیرہ سب ہی سے متعلق تفصیلات بھی اس ناول میں شامل کی گئی ہیں۔

اس ناول کے آغاز میں بہت سارے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے اور قاری کرداروں کے میلے میں گھومتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن آگے چل کر ناول نگار نے کرداروں کو اور ناول کو اپنی مخصوص روش پر لے آتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مرکزی قصے کے طور پر دو کرداروں نور جہاں اور سلطان حسین کے ازدواجی زندگی کو منظر عام تک لایا اس طرح انہوں نے پورے معاشرے کی تصویر کشی بھی کی۔ سلطان حسین انجینئر جنہوں نے امریکہ سے تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد وطن واپس آگئے۔ ہر سال وہ اپنی عیاشی پوری کرنے کی خاطر مسوری جاتا اور وہاں اس کے دوست اور محبوباؤں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور اس نے شادی کی کبھی کوئی خاص ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ سلطان حسین جن لڑکیوں سے اپنے معاشقے لڑاتا تھا ان سے شادی نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ اس کا نظریہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ بس ملاقات کی، بات چیت کی، چھیڑ چھاڑ کی اور خط و کتابت کی۔ بہت زیادہ بھی ہو گیا تو بوس و کنار اور اس کے بعد معاملہ شب باشی تک جا کر ختم ہو جاتا۔

شب باشی کے بعد والے معاملے سے وہ بہت خوفزدہ نظر آتا ہے کیونکہ اس میں باقاعدہ ذمہ داریاں لینی پڑتی ہیں جو کہ وہ نبھا نہیں سکتا۔ بلکہ ایسی ذمہ داریوں سے خائف نظر آتا ہے اس لحاظ سے سلطان حسین کا کردار مثبت نظر نہیں آتا بلکہ کمزور، ڈرپوک اور ذمہ داریوں کو نہ نبھانے والا ایک حقیر اور کمتر انسان نظر آتا ہے۔ جس میں معاشرتی گراوٹ کے تمام آثار نظر آتے ہیں کہ وہ وقت تو پاس کرنا چاہتا ہے مگر کوئی بھی ذمہ داری لینا نہیں چاہتا۔ جو کہ اسے ایک اینٹی ہیرو پیش کرنے کی نمایاں خوبی نظر اتی ہے۔ عزیز احمد اسی حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''دوسرا درجہ شب باشی سے شروع ہوتا ہے اور اس کو سلطان حسین برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا تصور تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں ذمہ داری ایام زچگیاں بچے اور روزمرہ کی زندگی کی بے رنگی شامل تھی۔ وہ مسوری ہر سیزن میں کم سے کم ایک نئے معاشقے کی کوشش کرتا رہا۔''(۵)

سلطان حسین عورت کو محض لطف کا ذریعہ تصور کرتا ہے۔ اس کے اندر ذمہ داریوں کے ساتھ عورت کو قبول کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں نظر آتی۔ بلکہ محض اپنے مفاد اور اپنی تسکین کے لیے عورت کو استعمال کرنا چاہتا ہے جو کہ ایک مہذب اور اچھے معاشرے کی خوبی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اسی حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ایسی تہذیب جس میں مہذب انسانوں کا کردار قابل تقلید ہوا تھا اب زوال سے ہمکنار ہے۔''(۶)

اس ناول میں عزیز احمد نے سلطان حسین کے کردار کے ذریعے معاشرے کے گرے پڑے کردار کی عکاسی کی ہے جس میں کوئی آفاقی خوبیاں یا ہیرو جیسی خوبیوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور ایسے کردار ہی اینٹی ہیرو کے تصور کو اجاگر کرتے ہیں۔ سلطان حسین جب اپنی بیوی نور جہاں کو ہنی مون کے لیے مسوری لے کر آتا ہے تو یہاں بھی اس کی عیاشیاں ختم نہیں ہوتی اور اپنی پرانی معشوق "کملا پردیش" سے ملنے چلا جاتا ہے اور اس کے ساتھ مل کر سینما بھی چلا جاتا ہے۔ جب واپس آتا ہے تو نور جہاں جب غصے کا اظہار کرتی ہے تو ڈر جاتا ہے اور سہم جاتا ہے کہ کہیں ساتھ والے نہ سن لیں۔ اگر اس کے اندر کوئی برائی نہ ہوتی تو یقیناوہ سہما ہوا نہ ہوتا ہمیشہ چور کی داڑھی میں تنکا ہوتا ہے اس لحاظ سے بھی سلطان حسین ایک کمزور اور بزدل کردار ثابت ہوتا ہے۔ ناول نگار نے اس کی عکاسی یوں کی ہے:

> "اس دن ناشتے کے بعد سلطان حسین اور نور جہاں میں واقعتاً بڑے زور کی لڑائی ہوئی بڑی سخت نور جہاں کو جتنے کوسنے یاد تھے اس نے سب دیے خوب روئی جب وہ ذرا چیخنے لگی تو سلطان حسین سہم کر خاموش ہو جاتا تاکہ قریب کے کمرے والے نہ سن لیں اور بالآخر بہت سی جھوٹی قسموں سے اپنے بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کے بعد اس نے فرخندہ نگر واپس چلنے کا وعدہ کر لیا۔"(۷)

سلطان حسین کا کردار اتنا گمراہ کن ہے کہ وہ اپنی بیوی نور جہاں کے تقدس کو بھی پامال کر کے رکھ دیتا ہے انتہائی گھٹیا سوچ کا حامل کردار جس میں طرح طرح کی برائیاں بھی پائی جاتی ہیں دراصل اس کردار میں سارا عامیانہ پن اور گھٹیا پن پایا جاتا ہے کہ جو کہ معاشرے کے اخلاقی اقداروں سے گرے ہوئے ہر شخص میں پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے سلطان حسین اینٹی ہیرو ہونے کی بھرپور مثال پیش کرتا ہے۔ جب کپڑا بیچنے والے آتے تھے تو وہ انہیں اپنی بیوی کے یار کر کے مخاطب کرتا ہے جو کہ انتہائی گھٹیا پن اور گری ہوئی سوچ کا کمتر کردار ثابت ہوتا ہے: مصنف اسی حوالے سے لکھتے ہیں:

> "دیکھو تمہارے یار پھر تم سے ملنے آئے ہیں سلطان حسین نے اس سے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا ادھر دو تین ہفتوں سے یہ جملہ سلطان حسین اکثر استعمال کرنے لگا تھا جب کپڑا بیچنے والے آتے تو وہ ان کو اس کے یار کہتا۔"(۸)

زینت نور جہاں کی دوست تھی اور جب بھی فرخندہ نگر آتی تو نور جہاں کو زبردستی اپنی پارٹیوں میں لے جاتی اس دفعہ وہ سینما میں گئے تھے اتفاق سے سینما میں اطہر اور نور جہاں پاس پاس بیٹھ گئے۔ نور جہاں نے اٹھ کر کہیں اور بھی بیٹھا چاہا مگر پھر اس نے سوچا یہ بدتمیزی کے زمرے میں نہ آجائے اور کسی کو خوامخواہ کا شک بھی نہ ہو۔ سلطان نے واپسی پر رستے میں ہی نور جہاں کو کہا آج تو تم نے اپنے اطہر کی گود میں بیٹھی تھیں۔ نور جہاں نے غصے سے کہا زبان سنبھال کے بات کرو اس وجہ سے معاملات ان کے درمیان مزید بگڑ جاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو رنڈی، نائکہ جیسے القابات دینے لگ جاتے ہیں اور پھر سلطان اس حد تک گر جاتا ہے کہ اس پر جسمانی تشدد شروع کر دیتا ہے۔ جو کہ ایک مرد کے کمزور ہونے کی نمایاں دلیل پیش کرتا ہے۔ درحقیقت سلطان حسین کا کردار معاشرے کے گرے ہوئے اور کمزور کردار ہونے کی خوب عکاسی کرتا ہے۔ اس حوالے سے عزیز احمد رقمطراز ہیں:

> "سلطان حسین اسے مارتا رہا: گھونسوں سے، تھپڑوں سے، گالوں پر، سر پر، پیٹھ پر، سینے پر۔ جب اس نے ہچکچا کے سلطان حسین کے ایک کان کو زور سے کاٹا تو وہ

بلبلا اٹھا اور اس نے اسے زور سے دھکیلا کہ وہ فولاد کی تجوری پر جا گری۔ اس کا سر فولاد سے ٹکرایا جیسے لوہے سے لوہا ٹکراتا ہے اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ جب وہ بے ہوش ہو کر گری تو سلطان حسین پر جو پہلی کیفیت طاری ہوئی وہ سکتے کی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہو گیا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی پر سے ہیبت کی سردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پہلا خوف کا احساس یہ ہوا کہ کہیں نور جہاں مر تو نہیں گئی۔ اس وقت نور جہاں کے مظلومت پر پچھتاوے کے ایک ناقابل بیان احساس کے ساتھ قتل کے مقدمے کے خوف کا ایک ایسا اثر اس کے دل پر طاری ہوا کہ بجلی کی طرح یہ تجویز اس کے ذہن میں دوڑ گئی کہ وہ خود بھی اپنا کام تمام کر لے۔"(۹)

سلطان حسین کے کردار میں جتنی پستی، بزدلی، خوف اور ڈر کا غلبہ دکھایا گیا ہے جو کہ اس کے کمزور ترین ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کردار میں اخلاقی پستی کا فقدان پایا جاتا ہے جو کہ اسے معاشرے کے گرے ہوئے کردار کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر عبد السلام اسی حوالے سے رقم طراز ہیں:

"اس ناول میں عزیز احمد کا مقصد حیدرآباد کے جاگیر دار دولت مندوں کی گھناؤنی زندگی اور ان کی اخلاقی پستی کی تصویر پیش کرنا تھا۔"(۱۰)

اس کے بعد نور جہاں گھر چھوڑ کر واپس اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے اور وہ کہتی ہے کہ میں اس شخص کے ساتھ مزید گزارہ نہیں کر سکتی اور خلع کا دعوی کر دیتی ہے۔ وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے جب وقت گزر گیا تو صدمہ بھی ختم ہوتا گیا اور نو جہاں نے اطہر سے شادی کر لی اور اس کے ساتھ خوشی خوشی اپنی زندگی بسر کرنے لگی۔ دوسری طرف سلطان حسین نے خدیجہ سے شادی کر لی اور اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو گیا مگر پھر بھی اس کے دل سے نور جہاں کا خیال کبھی بھی غائب نہ ہوا۔ دراصل سلطان حسین کو نور جہاں سے عشق نہیں تھا اسے بس یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس نے ایک عورت کے ہاتھوں شکست کھائی ہے جس کی وجہ سے وہ خود کو کمزور، بزدل اور ڈرپوک سمجھنے لگا کیونکہ ہمت اور بلند حوصلہ جیسی خوبیاں تو اس کے ہاں موجود نہیں تھیں۔ اور اب وہ اپنے آپ کی اندر ہی اندر شکست تسلیم کر چکا تھا جو کہ اس کی پست حوصلگی کی عکاسی کرتی ہے۔ ناول نگار اس کی پست حوصلگی اور افسوس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"یہ کہنا تو مبالغہ ہو گا کہ سلطان حسین کو اب بھی نور جہاں سے عشق تھا، عشق تو اسے نہیں کیونکہ عشق کے لیے جس ذہنی اور اخلاقی ایثار کی ضرورت ہے وہ اس سے محروم تھا۔ نور جہاں کے ہاتھ اس نے شکست کھائی تھی اور اسے اب اس قسم کا افسوس تھا جیسے چڑی مار کو ہاتھ سے کسی بٹیر کے چھوٹ جانے یا عیاش اور مقروض امیر کو اپنی دولت کے ہاتھ سے نکل جانے کا ہو۔"(۱۱)

دراصل اس ناول میں مصنف نے سلطان حسین کے کردار کو مرکزی کردار ہونے کے باوجود ہیرو بننے سے قاصر دکھایا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر کہیں بھی ہیرو جیسی خصوصیات ہمیں دکھائی نہیں دیتی بلکہ اس میں ہیرو جیسی خصوصیات کا فقدان پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سلطان حسین کا کردار معاشرے کی اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والا کردار ہے جس میں منفی سوچ، ڈرپوک،

بزدل، خوفناک اور کم حوصلگی دکھائی گئی ہے۔ ان تمام خصوصیات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سلطان حسین کا کردار اخلاقی گراوٹ کا کردار ہے جو محض خود کی خواہشات کو ترجیح دیتا ہے اور باقیوں کی عزت کو پامال کرنا اسے آتا ہے۔ اس لحاظ سے سلطان حسین کا کردار اینٹی ہیرو ہونے کا بھرپور اور نمایاں ثبوت پیش کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کلیم الدین احمد، پروفیسر، فرہنگ ادبی اصطلاحات، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۶ء، ص:۱۴

2. Harry Shaw, Consise Dictionary of Literary Term, New York: P:19

۳۔ عتیق اللہ، ادبی اصطاحات کی وضاحتی فرہنگ جلد اول (A تا D) لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۹، ص:۲۰۳۔۲۰۴

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات توضیحی لغت، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۹، ص:۵۳

۵۔ عزیز احمد، ایسی بلندی ایسی پستی، لاہور: مکتبہ جدید، ۲۰۲۰ء، ص:۴۷

۶۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول ہیئت، اسالیب اور رجحانات، ۱۹۴۷ء سے ۲۰۰۷ء، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ۲۰۱۶ء، ص:۱۸۴۔۱۸۵

۷۔ عزیز احمد، ایسی بلندی ایسی پستی، ص:۹۷

۸۔ ایضاً، ص:۱۲۰

۹۔ ایضاً، ص:۱۴۷

۱۰۔ عبد السلام، ڈاکٹر، اردو ناول بیسویں صدی میں، کراچی: اردو اکادمی، ۱۹۷۳ء، ص:۴۶۷

۱۱۔ عزیز احمد، ایسی بلندی ایسی پستی، ص:۱۷۷

References in Roman Script:

1. Kaleem u Din Ahmad, Professor, Farhang-e-Adbi Istlahat, New Dehli: Tarqi Urdu Beuru, 1986, P:14
2. Harry Shaw, Consise Dictionary of Literary Term, New York: P:19
3. Ateeq Ullah, Adbi Istlahat ki Wazahti Farhang part 1(A-D), Lahore: Fiction House, 2019, P:203,204
4. Saleem Akthar, Dr, Tanqeedi Istlahat Tozeehi Lugat, Lahore: Sang-e- Meel Publications, 2019, P :53
5. Aziz Ahmad, Aisi Bulandi aisi pasti, Lahore:Maktba e Jadeed, 2020,P :47
6. Mumtaz Ahmad Khan, Dr, Azadi k baad Urdu Novel Hait, Asaaleeb and Rujhanat(1947 to 2007), Karachi: Anjman –e-Taraqi Urdu, 2016, P:184-85
7. Aziz Ahmad, Aisi Bulandi aisi pasti, P:97
8. Ibid, P:120
9. Ibid, P:147
10. Abdul Islam, Dr, Urdu Novel Besween Sadi Mai, Karachi: Urdu Academy, 1973, P :467
11. Aziz Ahmad, Aisi Bulandi aisi pasti, P :177